Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:1 (1968)

(آخری قسط)

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلیدی اور تخلیقی

الطاف جاوید

موجودہ دینی مدارس کی ہیئت و ترکیب، اُن کا نصابِ تعلیم و نظامِ کار، اپنے قیام کے لئے اُنہیں کن طبقوں سے مالی مدد لینا پڑتی ہے، اور اس کے نتیجے میں قدرتاً اُن کی خوشنودی کا اُنہیں خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر ان دینی مدارس کی اجتماعی و ذہنی فضا۔ غرض ان سب چیزوں نے مل کر ان مدارس کو علیحدگی پسندی، فرقہ پروری اور جمود کا گڑھ بنا دیا ہے۔ یہ نہ صرف جدید علوم و فنون سے دُور ہیں۔ بلکہ اُن میں ان کے بارے میں بغض و تنفر پایا جاتا ہے۔ یہ مدارس گزشتہ کئی صدیوں سے ملت کی فکری و عملی ترقی میں سدِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ اور مسلمان جو آج دنیا کی دوسری قوموں سے زندگی کے ہر شعبے میں بہت پیچھے ہیں۔ تو اس کا ایک بڑا سبب ہمارے یہ مدارس ہیں۔

ان مدارس نے گزشتہ صدیوں میں ہر نئے فکر اور ہر نئے نظام کی مخالفت کر کے انگریزیشن کی یاد تازہ کر دی۔ کہا گیا ہے کہ انگریزیشن کی مثال بے محل ہے، کیونکہ یہاں کے دینی علماء نے سائنسی ایجادات کی مخالفت نہیں کی۔ مگر یہ کہتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کے برطانوی عہد کے اوائل میں جب یہ سائنسی علوم اور ایجادات یہاں پہنچے تو اُس وقت ہمارا دینی طبقہ اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ ورنہ ایسا کیوں ہوا کہ جس مسلم ملک میں اِن جدید علمی، سائنسی اور صنعتی قوتوں نے قدم رکھا۔ تو سب سے پہلی ٹکر اسی دینی طبقہ سے ہوئی۔ اور نہ صرف مسلم ممالک میں بلکہ غیر مسلم ممالک میں بھی ایسا ہوا کہ وہاں کا مذہبی طبقہ اِن ترقی یافتہ قوتوں کے آڑے آیا۔ تاریخِ اسلام کے صفحات پر کئی ایسے خونِ ناحق ہیں جو ایک زمانے میں اس مذہبی طبقہ کی عقیدہ پرستی اور ظاہر نوازی کی وجہ سے، اس لئے بہائے گئے کہ اُن دنوں اسے اقتدار حاصل تھا۔ شیخ الاشراق اور منصور حلاج وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ حکماءِ اسلام، عقلیت کے

پشت پناہی کرنے والے متکلمین اور وقت کے دھارے کے ساتھ ملّت کو قدم ملانے کی تلقین کرنے والے مصلحین اور مفکرین کے خلاف ہر عہد میں ان فقیہوں اور عمائدینِ مذہب نے نفرت پھیلانے اور اُن پر کفر کے فتاویٰ صادر فرمانے کا عمل جاری رکھا۔

وہ مذہبی زعماء جن کی زبانیں محض اُن کی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کو گستاخ، ملحد و زندیق، دریدہ دہن اور دشمنِ دین و رسول جیسے القابات سے سرفراز فرماتی رہتی ہیں، اگر اُن کے ہاتھ میں اقتدار دے دیا جائے تو یہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ان دینی پیشواؤں کے عہدِ اقتدار میں سائنسی ایجادات اور سائنسی تفکر وجود میں آتا تو یہ اُن کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے، جب کہ آج بھی نئے فکر کے بانیوں کے خلاف اس طبقہ کے افراد، صحت مند تنقید کی بجائے غیر محتاط لہجہ میں گفت گو فرماتے رہتے ہیں۔

لہٰذا محض یہ کہنا کہ قومی ترقی کو کسی عالمِ دین نے روکنے کی کوشش نہیں کی، محض خود فریبی اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور اسلام کی جدید تقاضوں کے مطابق تشریح و تفسیر کرنے کی اپیل کے خلاف کس کس طرح کی گوہر افشانیاں کی جاتی ہیں۔

کہا گیا ہے کہ صدر ایوب کو مصطفےٰ کمال اور جمال عبدالناصر وغیرہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرنا اسلام سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات اسلام سے قطعاً بے بہرہ اور ان کا رویہ دشمنِ دین تھا۔

اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری مذہبی قیادت اُس فراستِ مومنانہ سے محروم ہو چکی ہے، جس کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ "وہ اللہ کے نور سے دیکھتی ہے" اور اللہ کے متعلق قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ اُس کی شان ہر آن بدلتی ہے۔ حضرت امام ولی اللہؒ نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ کی شان کی تبدیلی ادوار تشکیل کرتی ہے۔ لہٰذا ان تصریحات کی روشنی میں اس حدیثِ مطہرہ کا مفہوم یہ ہوا کہ مومن کی فراست تاریخ کے ہر نئے دور کے نئے تقاضوں کو پہچان لیتی ہے۔ کیوں کہ اللہ اپنے آپ کو اپنی انہیں شئونِ متجددہ کے ذریعہ ظاہر فرماتا ہے۔

لہٰذا جب جاگیر داری عہد کی شبِ طویل کا پچھلا پہر آگیا اور اُس کی سیاہی بکھرنے لگی اور

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی سحر طلوع ہونے لگی اور صنعتی انقلاب کا آفتاب، جب اپنی تیز روشنی اور زندگی بخش حرارت کے ساتھ چمکنے لگا، تو حق تعالیٰ کی شان نے ایک نئے ترقی پسند عہد کا آغاز کر دیا۔ تو اس جدید عہد میں زندگی نے کرۂ ارض کے ہر خطہ میں اپنے قدیم لبادہ کو اُتار پھینکا، جسے عقل قیاسی، سورماؤں کی جنگ جُو مہموں اور زرعی غلامی کے تار و پود سے بُنا گیا تھا۔

اس لبادہ کے اُتارنے سے حیاتِ انسانی کے وہ حقائق عریاں ہونے لگے جو آج تک چشم آدم سے پوشیدہ تھے۔ اب یہ عہد علمی تحقیق کے لئے منطق کے اصولِ استقراء کو استعمال کرنے، فطرت کی قوتوں پر شبخوں مارنے اور انہیں مطیع کرنے، فطرت اور تاریخ کے تخلیقی ارتقاء کے عمل کو جاننے اور حرکت تغیر اور ارتقاء کو وجود کا بنیادی قانون سمجھنے کا عہد تھا۔ جہاں اس عہد میں زندگی کا ہر شعبہ نئے حقائق کے انکشاف سے دگرگوں ہوا، وہاں مذہب بھی ان سے دوچار ہوا۔ اور اُس نے بھی اس نئے عہد کو لبیک کہتے ہوئے اپنے بنیادی عقائد کی تشریح و تفسیر اس عہد کے مطالبات کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ مصطفےٰ کمال اور جمال عبدالناصر وغیرہ جدید صاحب اقتدار مصلحین کا جُرم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ اُنہوں نے مذہب کے اس نئے جامہ کو مثبت طور پر تسلیم کر لیا، جسے تاریخ کے نئے صنعتی انقلاب نے اُسے اُوڑھایا تھا۔ لامحالہ اس سلسلہ میں اُنہیں اُس مذہبی پیشوائیت کے خلاف قدم اُٹھانا پڑا، جو اسلام کے جاگیرداری عہد کے لبادہ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے قرآن حکیم، نماز اور اذان وغیرہ کے مطالب سے عوام کو آگاہ کرنے کے لئے مقامی زبانوں میں ادا کرنے کا تجربہ کیا۔ اور ایسی ہی ضروری اصلاحات نافذ کیں۔ جن کے نفاذ سے اسلام عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گیا۔

ہمارا مذہبی طبقہ چونکہ حرکت کے تخلیقی عمل کے بجائے اُس کے میکانکی عمل کا قائل ہے۔ اس لئے اسلامی لٹریچر میں تجدید اور مجدد کے الفاظ کی تعبیر بھی حرکت کے اسی میکانکی تصور کے ماتحت کی جاتی ہے اور عیاں ہے کہ میکانکی حرکت دَوری حرکت کا دوسرا نام ہے جو ایک ہی دائرہ میں چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اور اس دائرہ سے وسیع تر ادوار میں قدم نہیں رکھتی۔ یعنی یہ میکانکی حرکت تخلیقی اور ترقی پسند نہیں ہوتی۔

مگر اسلامی ادب میں تجدید کا حقیقی مفہوم تخلیقی اور ترقی پسند ہے۔ کیوں کہ اسلام تاریخ

کے تخلیقی ارتقائی عمل کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر تاریخ کا ہر دور اپنے ماقبل دور سے وسیع تر، کامل تر اور زیادہ پُرمایہ ہے تو تجدید کا مفہوم بھی یہی ہونا چاہیئے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تاریخ کے ایک نئے دور میں اسلام کو اُس تشریح و تجدید سے وابستہ رکھنے پر زور دیا جائے جو اس نئے دور سے پہلے دور میں کی گئی تھی۔

دراصل حدیثِ مجدد کا مفہوم ہی یہ تھا کہ اسلام تخلیقی تجدید کے ذریعہ تاریخ کے ہر ارتقاء پذیر عہد کے مزاج کے مطابق اپنے بنیادی نظریات، عقائد اور تعلیمات کے نئے نئے پہلوؤں اور زاویوں کا مسلسل انکشاف کرتا رہے گا، جو روزِ اول ہی سے حق تعالیٰ نے اُن کے اندر محفوظ کر رکھے تھے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس بصیرت اور فراست کو ہمارے مذہبی رہنماؤں کی بجائے حق تعالیٰ نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ایک عبقری پر منکشف فرمایا ہے۔ جس نے قرآن حکیم کے متعلق لکھا تھا ؎

صد جہاں پوشیدہ در آیاتِ اُوست　　عصرہا پیچیدہ از آناتِ اُوست

اگر اس حقیقت کو مان لیا جائے، جسے اس شعر میں بیان کیا گیا ہے تو اسلام اور قرآن کی تشریح و تفسیر پر کسی مخصوص طبقہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے کسی خاص فرد یا افراد کو اس کام پر مامور ہونے کی سند نہیں عطا کی۔ اس کام کو ہر وہ فرد انجام دے سکتا ہے، جو اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ختم نبوت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ اسلام کی تشریح و تفسیر کسی خاص مذہبی طبقہ کے سپرد کر دی جائے، بلکہ اس سے مراد آزادیٔ فکر اور تنقیدی رویہ کی اہمیت کو سمجھنا تھا۔ اسلام میں کسی پریسٹ ہڈ یا مذہبی پیشوائیت کے لئے جگہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طبقہ کے وجود میں آنے سے زندگی دینی اور دنیوی خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور سادہ ذہن عوام کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے یہ آئے دن مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا مصطفےٰ کمال اور جمال عبدالناصر وغیرہ نے اپنی پس ماندہ اور شکست خوردہ قوموں کو حیاتِ تازہ بخشی ہے اور اپنی تاریخی ذمہ داری کے ماتحت اسلام کی نئی تفسیر و تجدید کی ہے۔ جس سے اس کی قدیم ہیئت و صورت کا بدل جانا لابدی تھا۔ اور تبدیلیٔ ہیئت کو اسلام دشمنی اور اسلام کُشی سے تعبیر کرنا ایک غیر عقلی بات ہے۔ ویسے بھی ان رجالِ عظیم کے خلاف اس قسم کی بے احتیاط گفت گو اور بیان بازی پاکستان اور ان مسلم ممالک کے درمیان منافرت اور عناد پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے اور اس طرح اسلامی ممالک کے اتحاد کے تصور کو بھی سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

کہا گیا ہے کہ علماء نے برس ہا برس کی محنت اور مطالعہ سے دینی علوم کو حاصل کیا ہے۔ اس لئے دینی معاملات میں اُن کی رائے "سند" کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ دینی معاملات میں دخل دے یا علماء کی رائے کو رد کرنے کی کوشش کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے علماء کے طبقہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو دینی علوم میں کافی دست گاہ رکھتے ہیں اور اپنے مسلک اور حلقہ میں بہت اونچے مقام کے مالک ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی یہ دست گاہ اور رسوخ فی العلم تخلیقی نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ اُنہوں نے ان علوم کو صرف پڑھا ہے، اُن میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اور اس تقلیدی روش کو، درسِ نظامی کے دینی مضامین جیسے حدیث، تفسیر، فقہ اور علم الکلام میں ہی قائم نہیں رکھا گیا، بلکہ اُسے اُس کے غیر دینی مضامین یعنی منطق، فلسفہ، ریاضی اور طب وغیرہ میں بھی اپنانے پر اصرار کیا جاتا ہے، جن میں پچھلی کئی صدیوں سے بے حساب اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی معاشرتی اور سائنسی علوم کے ساتھ ایسا ہی تقلیدی سلوک ہوتا تو آج انسانی زندگی جامد اور ٹھٹھر کر رہ جاتی۔

علم چاہے دینی ہو یا غیر دینی، یہ معاشرہ اور فطرت میں عقل کے تحقیقی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جستجو میں سرگرداں رہنے والی انسانی رُوح ہر دم فطرت اور معاشرہ کے اسرار کو بے نقاب کرتی رہتی ہے۔ اور اس نقاب کشائی سے فطرت اور معاشرہ کے نئے نئے رُخ اور زاویئے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ رُخ اور زاویئے انسان کے تصورِ حیات و کائنات میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں اور یہ تبدیل شدہ تصورِ حیات و کائنات، مسائلِ حیات کا نئے نقطۂ نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ جس سے معاشرتی اداروں میں ہمہ گیر تبدیلی رُونما ہوتی ہے اور نئے نئے ادارے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح حیاتِ انسانی اپنی ہیئت و ماہیہ میں رواں دواں ایک مرحلہ سے دوسرے ارتقا پذیر مرحلہ میں قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا کسی علم کو اُس میں اضافہ کے بغیر حاصل کرنا، اُس کے اُصول و مطالب کو رَٹ لینا اور غیر تخلیقی طور پر مسائلِ حیات پر اُسے چسپاں کرنے کی کوشش کرنا، ترقی پذیر اور جاوداں ہر دم رواں حیاتِ انسانی کے معاملات کو سلجھانے کی بجائے اُسے اور اُلجھاتا رہتا ہے۔

نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے عیسائی اور یہودی مذاہب میں بڑے بڑے جید عالم پائے جاتے تھے، جو اپنے اپنے مذہب کے علوم میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ ان مذاہب میں عبادت گاہیں بھی

تھیں اور مذہبی تعلیم کے ادارے بھی، مگر یہ تمام اپنی جامد روش اور تقلید پسندی کی وجہ سے حیات سے کٹ چکے تھے۔ یہ ٹھٹھرے ہوئے تخلیقِ نو سے عاری علوم اور ادارے زندگی کی ترقی پسند رَو کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ لہٰذا مسائلِ حیات کو سلجھانے میں ناکام تھے۔ حق تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی بعثت کی شکل میں اِن علوم، عقائد اور اداروں میں ارتقاء، تخلیقی تجدید اور نئے اضافہ کا سامان مہیا کر دیا۔ اسلام کے تخلیقی عمل کی تیز و تند موجوں نے اِن بند پانیوں کے عفونت زدہ جوہڑوں کو پاٹ کر اُنہیں افکارِ تازہ کے آبِ جاں بخش سے لبریز کر دیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنے عہدِ زوال علوم و افکار کو جہاں چھوڑا تھا، حیات کے ترقی پذیر عمل نے دانشِ مغرب کی شکل میں اِن میں بے بہا اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارے علماء کا آج فرض ہے کہ وہ سابق ادوار میں عملِ الٰہی کی روش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس دانشِ تازہ کو حاصل کر کے دینِ اسلام کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت بنانے کی کوشش فرمائیں۔

جب ہمارے علماءِ مذہب خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور ارادۂ الٰہی اس مقصد کو مکمل کرنے کے لئے " وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم (محمد) کے قانون کے مطابق، دوسرے افراد کو تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُنہیں جھلاہٹ، نفرت کا اظہار کرنے اور کفر و نفاق کے فتاویٰ صادر فرمانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اگر ہمارے مذہبی دانش مندوں کو کلکتہ کے بشپ کالج اور کراچی کے کیتھولک کالج دیکھنے کی توفیق نصیب ہو تو اُنہیں معلوم ہو جائے کہ زندہ قومیں اپنے مُردہ اور محرّف شدہ مذاہب کی تعلیم کے لئے کیا کیا جدید ساز و سامان کا بندوبست کرتی ہیں۔ ان تعلیم گاہوں میں سے بشپ کالج میں تو گریجوایشن کے بعد طالب علم کو، جو عموماً جوان ہوتے ہیں، تین سالہ کورس سے گذارا جاتا ہے۔ اس مدت میں اُسے تمام مذاہبِ عالم کی تاریخ اور بنیادی تعلیمات، اس عہد کے ممتاز نظاماتِ فلسفہ کا جامع تعارف اور بائیبل کے ایک ایک لفظ کو اُس کے پورے تاریخی پسِ منظر کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ تین برس کی قلیل مدت کے بعد وہ بائیبل کے تمام امکنہ، شخصیات اور اقوام کے متعلق پوری جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی واقفیت کا مالک ہو جاتا ہے۔ کراچی کے کیتھولک کالج میں پانچ سالہ بچّہ کو داخل کیا جاتا ہے اور اُسے پندرہ سالہ کورس میں سے گذارا جاتا ہے۔ میں ایک دفعہ ایسے طالب علم سے ملا جو دس برس گذار چکا تھا۔ یعنی وہ پندرہ برس کی عمر میں تھا۔ میں اُس بچّے کی معلومات پر حیرت زدہ رہ گیا، وہ مذاہبِ عالم کی عام تاریخ

اور جغرافیائی پس منظر، عیسائیت کی بنیادی تعلیمات، فلسفہ کے اساسی قواعد اور علوم حاضرہ کے متعلق جنرل نالج کے متعلق اتنا کچھ جانتا تھا جس کی میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان درس گاہوں اور اُن کے پُر مغز اور پُر وقار شخصیتوں کے مالک طالب علموں کا مقابلہ جب دینِ اسلام کے اساطینِ مذہب کے زیرِ ہدایت چلنے والے دار العلوموں اور اُن میں تعلیم پانے والے طالب علموں سے کیا جاتا ہے تو اپنے آپ سے شرم محسوس ہوتی ہے اور ذہن کو احساسِ کمتری شدید صدمہ پہنچتا ہے۔ درسِ نظامی کی تعلیم سے فارغ التحصیل طالب علموں کی قرآن حکیم کے امکنہ، مذاہب، انبیاء اور اقوام کے متعلق جغرافیائی اور تاریخی علم کا جائزہ لیا جائے تو ناطقہ سر بگریباں اسے کیا کہیئے والا معاملہ نظر آتا ہے۔ فوری طور پر یہ کمی اس طرح پوری کی جا سکتی ہے کہ علماء کے لئے ریفریشر کورس کا انتظام ہو۔ یہ مشورہ اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ درسِ نظامی میں پڑھے ہوئے مضامین کے متعلق تھوڑی سی جدید معلومات حاصل کر لیں۔

آخر دینِ برحق کی تشریح و تفسیر کو ذہنی لحاظ سے اتنے شدید مفلس اصحاب کے سپرد کیوں کر دیا گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی اجتماعی کوشش نہیں ہو سکتی جو ہماری مذہبی تعلیم کو اس عہد کی جدید تعلیمی سطح تک بلند کر دے۔ اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے چہروں اور لباس سے کسمپرسی اور یتیمی کے آثار نمودار ہونے کی بجائے استغناء، علو ہمتی، وقار اور گہری علمی سنجیدگی نمایاں ہو۔ کیا ان تمام دار العلوموں کو ختم کر کے کسی ایسے مرکزی دار العلوم کو قائم نہیں کیا جا سکتا جس کا معیارِ تعلیم کم از کم بشب کالج جیسا ہو۔ آخر وہ دن کب آئے گا کہ ہمارا مذہبی عالم بھی حیاتِ جدید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت کر سکے گا۔ میرے خیال میں دینِ حق کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ایسے انتظام کو عمل میں لانا بے حد ضروری ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ میری ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ہمارے نظریات و عقائد میں کتنا زنگ آ چکا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اتنی قوت ہے یا نہیں کہ وہ اپنے فکری عمل میں وقت کے تیز بہاؤ کا ساتھ دے سکیں۔ ظواہر پرستی کو اپنا کر ہم حقیقت و معنیٰ کی کتنی مقدار کو ضائع کر چکے ہیں۔ اس بات کا پتہ لیں کہ ہماری صفوں میں کتنا انتشار اور ہماری فکری و عملی قوتوں میں کتنا ہزال اور تھکن پیدا ہو چکی ہے اور ہم نے توحید کی جگہ ثنویت کو اپنا کر اپنے آپ

پر کتنا ظلم کیا ہے ؟ ۔

اگر ہم دیانت داری کے ساتھ اپنی ان کمزوریوں اور خامیوں کا کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن کے ساتھ احتساب کر سکیں تو یقیناً حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ہمارے ساتھ ہو گی اور ہم اس کی مدد سے اُس خسران کو پورا کر سکیں گے، جسے کاروبارِ حیات کی انجام دہی میں ظلم و جہل کی روش اختیار کرنے سے ہم نے اپنے ہاتھوں کمایا ہے۔

اب میں ایک بار پھر وہی بات دُہراتا ہوں جو میں شروع میں کہہ آیا ہوں۔ عام طور پر مذہب کے بارے میں دو نظام ہائے فکر ہوتے ہیں۔ ایک تقلیدی اور دوسرا تخلیقی۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر علماء نے اوّل الذکر نظامِ فکر کو اپنا رکھا ہے، اور اُس پر وہ سختی سے قائم ہیں اور قائم رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہمارے یہ علماء اسلام ہی تھے، جن کی مخلص سعی و جہد کی برکت سے دینِ حق اپنی روایتی شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ مذہبی دارالعلوم ہی ہیں، جنہوں نے ہمارے قدیم مذہبی ورثہ کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔ دن میں پانچ وقت حیّ الی الفلاح کی گونجتی ہوئی جانفزا آواز، یہ مساجد، یہ درس و تدریس کا ذوق و شوق، یہ قرآن حکیم کے حفّاظ کی تیاری اور اسی طرح کے دیگر مذہبی اعمال کی انجام دہی انہی عالمانِ دین اور اُن کے دارالعلوموں کے طفیل قائم ہے۔ اس اعتراف کے باوجود اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی چھ صدیوں سے ان علوم مذہب اور اداروں میں جمود اور زوال پذیری اپنے قدم جما چکی ہے۔ آج مذہبی فکر و عمل اپنی نوعیت میں تخلیقی ہونے کی بجائے تقلیدی بن چکا ہے۔

ہماری یہ حالت اور بھی قابلِ افسوس ہو جاتی ہے جب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی کتابِ مقدس کے حامل ہیں جو حکماتِ الٰہی کے لامتناہی اور غیر مختتم ہونے کی تعلیم دیتی ہے، "اگرچہ روشنائی کے کئی سمندر اور روئے زمین کے تمام درختوں کی اقلام انہیں لکھتے ہوئے ختم ہو جائیں"۔ یہ کلماتِ الٰہی وجود، اُس کے مظاہر اور ان کے مضمرات کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ ہی ہے جو وجود اور اُس کے مظاہر کا اوّل و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔ یہ اللہ ہی ہے جس کا نور سماوات و ارض میں پھیلے ہوئے مظاہرِ وجود کی صورت میں ہم پر عیاں ہو رہا ہے۔ اور یہ وجود مطلق ہی ہے جو ہر آن اپنی نئی شان میں جلوہ گر رہتا ہے۔ لہٰذا قافلہ وجود کی رفتار و حرکت میں کہیں بھی اور کسی لمحہ بھی ٹھہراؤ کو تسلیم کرنا قرآن حکیم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہو گا۔

کیوں کہ قرآن اپنے فکری عمل (پراسس PRACESS) میں جمود اور رجعت پسندی کو کسی شکل میں بھی قبول نہیں کرتا۔

چونکہ زمان و مکان کے اس محسوس مرحلہ میں کوئی شے یا شخصیت مکمل نہیں ہے۔ لہذا تنقید سے گھبرانے کی بجائے اُسے لبیک کہنا چاہیئے۔ کیونکہ تنقید ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ ہم اپنے انفرادی اور ملی وجود اور اُس کے تقاضوں کو مکمل کر سکتے ہیں۔ تنقید بدصورتی کی تہہ میں چھپے ہوئے حُسن کو کرید کر باہر لانے کا نام ہے۔ تنقید ایک آئینہ ہے، جس میں ہم اپنے چہرے کے داغ بھی دیکھ سکتے ہیں اور اپنے حُسن کو بھی۔ تنقید بدن کے اُس حصہ کی نشان دہی کرتی ہے، جہاں بیماری اپنا قبضہ جما چکی ہے اور عیاں ہے کہ طبقۂ علماء میں بھی پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں۔ تنقید عمل کے لئے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ تنقید کرنے والا ذہن آسمانی نہیں ہوتا۔ وہ بھی ملی وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ملت کی تنومندی یا کمزوری سے وہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بے لوث، غیر جانبدار اور مفاد پرستی سے الگ ہو کر جب مطالعہ کرتا ہے تو اس قابل ہو جاتا ہے کہ معروضی حقیقت میں اگر کہیں جھول آچکا ہے تو اُسے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ سمجھنا بھی شدید غلطی ہے کہ علماءِ مذہب وجودِ ملی سے ماوراء وجود رکھتے ہیں۔ یہ بزرگ شخصیتیں ملت کے وجود کا ایک قابلِ قدر حصہ ہیں۔ لهذا اُن پر تنقید دراصل اپنے آپ پر اور پورے ملی وجود پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جسم کے ایک حصہ کا بگاڑ پورے جسم کی صحت و قوت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ غلطی اور کجی ہر عضو میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لہذا حق تعالیٰ کی نئی شان اور اس کے تقاضوں کے مطابق اگر مذہبی علوم اور اداروں میں مناسب تبدیلیاں عمل میں لانے کا مشورہ دیا جائے تو اُس پہ چیں بجبیں ہونے کی بجائے ہمدردانہ غور و فکر کرنا ہی مومنانہ فراست کی دلیل ہے۔

آخر میں میں اُن الفاظ کو دہراتا ہوں، جن میں علامہ اقبالؒ نے کبھی بہی خواہانِ ملت سے اپیل کی تھی

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم — قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر — کہ دل در سینۂ مُلا گدازیم